انتظار حسین کے ناولوں میں ہجرت بہ طور نفسیاتی مسئلہ

ڈاکٹر عابدہ نسیم[1]

Abstract:

The partition and migration is a very complicated and multidimensional event of our history. Most of Pakistani writers have presented migration as a topic through their creative genres. All the aspects of migration and its results upon human life have been presented through PakistaniUrdu novel. Migration is basically a psychological problem and it have a some very strong and chronic effects upon human life. It creates many complications and confusions for the individual and society. Intizar Hussain has presented the migration as a psychological problem and he explored various aspects of psychological impact of migration through his novels. In this article the researcher has tried to study the effects of migration as a psychological problem in Intizar Hussain novels.

Keywords: Intizar Hussain, Urdu Novel, Migration, Partition, Psychological Problem, Psychological Study.

کلیدی الفاظ: انتظار حسین، اردو ناول، ہجرت، تقسیم، نفسیاتی مسئلہ، نفسیاتی مطالعہ

ہجرت ایک گھمبیر اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کئی متنوع جہتوں میں سفر کرتے ہیں، اس کے مضمرات کو کسی ایک مطالعے میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں دنیا کی ایک بڑی ہجرت رونما ہوئی۔ اس ہجرت نے انسانی معاشرے پر جو نقوش چھوڑے اس کے اثرات تاحال جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ یہ ہجرت اپنی صورت پذیری میں اتنی بحرانی ثابت ہوئی کہ دہائیاں گزر جانے اور نسلیں تبدیل ہو جانے کے باوجود اس کے ثمرات یہاں کا باسی بھگت رہا ہے، یوں تو اس ہجرت نے تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، معاشرت اور معیشت سبھی کو تقلیب کے عمل سے گزارا لیکن اس کا نفسیاتی پہلو سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت اپنی نوعیت میں ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اور فرد کی زندگی اور ذہن و

1 لیکچرر، شعبہ اردو و مشرقی زبانیں، سرگودھا یونی ورسٹی

قلب پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے چھٹکارا پانا زندگی بھر کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ ہجرت کے دیگر مسائل اور بحران وقت کے ساتھ کنٹرول کیے جا سکتے ہیں مگر ہجرت کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور تلخیوں کو مہاجر کے ذہن سے مٹانا بہت مشکل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ناولوں میں جس مصنف کے ہاں ہجرت کے نفسیاتی زاویوں کی پیشکش اور تفہیم سب سے زیادہ نظر آتی ہے وہ انتظار حسین ہیں۔ انتظار حسین اپنے خاندان کے ساتھ خود بھی ہجرت کے عمل سے گزرے اور انھوں نے ہجرت کے اس بھیانک تجربے کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اس سے جڑی تاریخی جبریت اور فرد کی بے مائیگی کو براہ راست مشاہدہ کیا۔ اس حوالے یہ پہلو بھی اہم ہے کہ انتظار حسین کا تعلق ہندوستان کے اس خطے سے ہے جہاں کے باسیوں پر دیگر خطوں کی نسبت ہجرت کے نفسیاتی اثرات سب سے زیادہ مرتب ہوئے۔ دلی اور اس کے اطراف اور یوپی سے تعلق رکھنے والی مڈل کلاس اور اشرافیہ نے جب ہندوستان سے ہجرت کا فیصلہ کیا تو ان کے لیے یہ صدمہ موت سے کم نہیں تھا، یہ وہ علاقے تھے جہاں تحریک آزادی کا زور رہا تھا۔ یہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ، سرکاری ملازم، جاگیردار اور تجارت پیشہ آسودہ حال افراد بستے تھے۔ یہاں کے عوام کا سیاسی شعور پختہ تھا اور انھوں نے ہندوستان کی مسلم نشاۃ ثانیہ کے لیے بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا تھا۔ اس طبقے نے ہندوستان کے ان علاقوں میں ایک پختہ تہذیبی تشخص حاصل کر لیا تھا اور اب بیسویں صدی کے نئے سیاسی و سماجی منظر نامے پر آزاد ہندوستان میں اپنی اس مخصوص شناخت کی بقا کے خواہاں تھے۔ تعلیمی اور سیاسی شعور کی بنا پر انھیں اپنی طاقت کا احساس بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریک آزادی کے لیے بھرپور کردار ادا کیا لیکن ان کے ذہنوں میں خود پاکستان جانے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس لیے جب اس طبقے کو ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑا تو وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ بہت زیادہ کنفیوز، ذہنی دباؤ کا شکار اور تشویش ناک کیفیات میں مبتلا ہوئے۔ انتظار حسین کے ناولوں میں زیادہ تر اسی طبقے کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے نفسیاتی مسائل کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں ہجرت کے جن نفسیاتی مسائل کو

اٹھایا گیا ہے ان میں شناخت کے مسائل سب سے نمایاں ہیں اس کے علاوہ جڑوں کی تلاش، ناسٹلجیا، ڈپریشن، داخلی شکست وریخت اور ذہنی انتشار جیسے مسائل شامل ہیں۔

ہجرت کے نتیجے میں کسی بھی معاشرے کا فرد جس مسئلے کا سب سے زیادہ شکار ہوتا ہے وہ شناخت کا مسئلہ ہے، جو سوال کسی بھی مہاجر کو سب سے زیادستاتا ہے وہ یہ ہے کہ میں کون ہوں؟ شناخت کا مسئلہ اتنی گھمبیر صورت اختیار کرلیتا ہے کہ فرد کی ذہنی صلاحیت بری طرح مجروح ہو جاتی ہے اور وہ تشکیک اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں فرد کی ذات کئی خانوں میں بٹ جاتی ہے اور باطنی اور خارجی اور شعوری اور لاشعوری سطح پر وہ کئی حیثیتوں میں منقلب ہو جاتا ہے۔[1] ایسے افراد کو وجود کی گم شدگی کا خوف لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اپنی پہچان کھونے لگتے ہیں اور ان کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔

ناول بستی میں قیام پاکستان کے پس منظر، فسادات، ہجرت اور سقوط مشرقی پاکستان تک کے سیاسی وسماجی حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔اقدار کی شکست وریخت، سماجی اگاڑ پچھاڑ اور سیاسی بے سمتی جیسے عوامل نے مل کر ایک ہولناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ پورا معاشرہ تقلیب کے عمل سے گزر رہا تھا۔انتظار حسین نے بڑے معنی خیز اور علامتی انداز میں یہ دکھایا ہے کہ بستی کے یہ مکین رفتہ رفتہ کیسے کایا کلپ کے عمل سے گزرے۔جب وہ روپ نگر سے چلے تھے تو کوئی اور تھے اور اب اس بستی میں آکر ان کے حواس مختل ہو گئے، وہ احساس سے عاری ہو گئے اور ان کا وجود گم ہوتا چلا گیا۔ذاکر جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو اسے سڑکوں پر چلنے والے لوگ کوئی اور ہی مخلوق نظر آتے ہیں:

> ''یہ تو ایسے چل رہے ہیں جیسے اپنی پہچان کھو چکے ہوں اور میں؟ کہیں میں بھی تو ایسے ہی نہیں چل رہا ہوں۔وہ ایک دم سے ٹھٹھک گیا اپنی غیر انسانی سی چال کو دیکھ کر اسے عجیب سا خیال آیا کہ وہ نہیں اس کی جگہ کوئی اور چل رہا ہے مگر کون؟ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔۔۔۔۔۔ عجب بات ہے میں چل یہاں رہا ہوں اور میرے قدموں کی آواز وہاں سے آرہی ہے۔۔۔ کہاں سے۔۔۔۔۔۔ میں کہاں چل رہا ہوں؟ کس زمین پر قدم پڑ رہے ہیں؟ اس نے حیران ہو کر ادھر ادھر نظر ڈالی۔سب سنسان ویران، جیسے بستی خالی ہو گئی ہو۔مکان و

سراو جاسب خالی۔۔۔ بس چاروں طرف سے آتی ہوئی کترنے کی آواز جیسے بہت سے چوہے کچھ کتر رہے ہوں۔''(۲)

زمین انسانی شناخت کا بہت بڑا مظہر ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی اساطیر میں زمیں ماں کا روپ ہے، مقدس ہے اور دھرم کا درجہ رکھتی ہے۔ زمین پیوستگی اور زرخیزی کا استعارہ ہے اور اس خطے کے باسی کی زمین کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہے۔ یہاں کا باسی اپنی زمین میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر وہ جہاں بھی جائے زمین کی گرفت سے خود کو آزاد نہیں کرا سکتا۔ انتظار حسین نے دکھایا ہے کہ اپنی زمین سے جدا ہونے والے اس بستی کے مکین بے زمینی کے کرب کا شکار ہو گئے تھے اور اس صدمے نے رفتہ رفتہ انھیں بے چہرگی میں مبتلا کر دیا۔ اپنی زمین سے اکھڑ کر اور اپنی جڑوں سے کٹ کر اب انھیں اپنے وجود کی شناخت کا مسئلہ در پیش ہے:

''۔۔۔ میرے اندر زمانے اور زمینیں درہم و برہم ہیں کبھی کبھی بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کہاں کس جگ میں ہوں۔ دن ڈھل چکا شام ہونے کو ہے، جنگل کے رستے سنسان ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ڈگ بھرتا اپنے غار کی طرف جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ زمانے اور زمینیں میرے اندر درہم برہم ہیں۔ میں کہاں چل رہا ہوں؟ کس زمانے میں کس زمین میں؟ ہر سو درہمی ہر مقام پر ابتری۔ جنگل سے نکل کر بستی میں آیا مگر کس بستی میں؟ آدمی نہ آدم زاد سنسان کوچے ویران گلیاں، دکانیں بند حویلیاں مقفل۔''(۳)

مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ شناخت کے معدوم ہونے کے خوف نے لوگوں کو انتہائی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا اور ان کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ وجود کی گمشدگی کا کمپلیکس تشکیک اور کنفیوژن کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ہونے اور نہ ہونے کی سولی پر لٹکے یہ انسان اب اس مقام پر آ چکے تھے کہ وجود کے اثبات کی تلاش اب وجود کی نفی کا روپ دھار چکی تھی۔ نفسیاتی پیچیدگی نے بغاوت اور انحراف کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب وہ ہر قسم کے وجود، رشتے اور شناخت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو چکے تھے۔ یار میں یہ محسوس کرتا ہوں۔۔۔ یہ سفید سر والا آدمی میرے سفید سر والے باپ سے بھی زیادہ جاہل ہے۔۔۔ میرا باپ تیرے سفید سر والے باپ اور اس۔۔ سفید سر والے آدمی دونوں سے زیادہ جاہل ہے۔ مگر میرا باپ میرا باپ نہیں

ہے۔۔ میں حرام زادہ ہوں۔۔۔ میں اپنے باپ کو اپنا باپ ماننے سے انکاری ہوں۔ یار ہمارے مکروہ باپوں نے ہمیں برباد کرڈالا۔ (۴)

یہاں پر انتظار حسین کے ذہن پر کافکا کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کافکا سے کافی متاثر تھے اور اس کے Meta Morphosis کی طرح ان کے ہاں بھی کایا کلپ اور شناخت کی گم شدگی کے تصور کو بڑی گہرائی اور پہلوداری سے پیش کیا گیا ہے۔ وجودیت اور معدوم ہوتی ہوئی شناخت کے حوالے سے ان کی تحریریں ایک الگ مطالعے کی متقاضی ہیں۔ دور حاضر کے Postmodern and Globalized منظر نامے کے تناظر میں ان کی تحریروں کا ایسا مطالعہ بہت نتیجہ خیز ہوگا۔

بعض کرداروں پر اس صورت حال کا یہ ردّ عمل مرتب ہوا کہ وہ شدت سے جڑوں کی تلاش کے المیے کا شکار ہو گئے۔ اپنے مشکوک وجود نے انھیں اپنی اصل کی بازیافت پر مجبور کیا۔ چھوڑی ہوئی سرزمین کا سحر ان کے ذہن و قلب پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ مصنف نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ان مضمرات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ نئی سرزمین میں پیوست ہونے سے قاصر تھے اور موجودہ معاشرے میں جذب ہونے میں ناکام رہے۔ اپنی زمین کے ساتھ والہانہ محبت اور وہاں کی باقیات اور آثار کی ملکیت کے احساس نے انھیں نئی زمین کو قبول کرنے سے مانع رکھا اور وہ اسے اپنی شناخت کا رتبہ نہ دے سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یوپی کے مہاجرین نے حالات کے پیش نظر بہ دل ناخواستہ ہجرت کی تو ایک عرصے تک وہ اس احساس میں مبتلا رہے کہ پاکستان میں ان کا قیام عارضی ہے اور وہ بہت جلد اپنی اصل زمینوں اور گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے آتے ہوئے گھروں اور جائیدادوں کو فروخت نہ کیا اور مقفل کر کے چلے آئے۔ (یہاں یہ تضادی بیانیہ بھی معنی خیز اور قابل توجہ ہے کہ ملک اور ریاست کے حصول کے لیے جدوجہد اور سیاسی نظریہ سازی ایک آئیڈلسٹک اپروچ تھی اور ملک کو چلانا، بسانا اور وہاں قیام پذیر ہونا اس کا وہ حقیقی پہلو تھا جس کی طرف کبھی ان لوگوں نے توجہ نہ کی تھی)۔ اس لیے جب حقیقت کی سفاکی مجسم ہوئی تو اس تضاد سے یہ لوگ چیخ گئے۔ ہجرت کے کرب اور اپنی تہذیبی جڑوں سے جدا ہونے کے صدمے اور بدقسمتی سے پاکستان کے

غیر مستحکم حالات نے اتنی کاری ضرب لگائی کہ وہ بلبلا اٹھے۔ وہ نئی سر زمین میں خود کو پرایا محسوس کرتے۔ چھوڑی ہوئی زمین اور کھوئی ہوئی شناخت کو یاد کر کے رنجیدہ ہوتے اور مزید شدت سے اپنا تعلق ماضی کے ساتھ جوڑنے کے جتن میں لگ جاتے۔ بستی میں ذاکر کے والد صاحب ایسا ہی ایک نمائندہ کردار ہیں جو حال اور ماضی کے مابین معلق ہیں اور تاحال اپنی شناخت کا تعین نہیں کر پائے:

> ''شجرہ، بوسیدہ مخطوطے، دیمک لگی پیلے ورقوں والی کتابیں، پرانے رقعے، پرچے، کب کب کے لکھے ہوئے نسخے، دعائیں، تعویز، ابا جان عینک لگائے ایک ایک تحریر کو غور سے پڑھتے جاتے تھے اور اس کی سپرد کرتے جاتے تھے۔۔۔ نہ جائیداد نہ روپیہ پیسہ اگر تھا تو ادھر ہی رہ گیا۔ بس یہی تھوڑے اوراق پارینہ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیٹے یہ اس گھر کی چابیاں ہیں جن پر اب ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور حق پہلے بھی کہاں تھا۔ دنیا جیسا کہ جناب امیر نے فرمایا مہمان خانہ ہے۔ ہم اور ہماری آرزوئیں اس میں مہمان ہیں۔ مہمانوں کا حق نہیں ہوا کرتا۔ زمین جتنا مہمانوں کو نواز دے اس کا احسان ہے۔ اور زمین کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ یہ چابیاں امانت ہیں۔ اس امانت کی حفاظت کرنا اور چھوڑی ہوئی زمین کے احسانوں کو یاد رکھنا۔''[۵]

ذاکر چابیوں کی یہ امانت لینے کے بعد سوچتا ہے کہ چابیاں یہاں میرے پاس ہیں اور وہاں ایک پورا زمانہ بند ہے۔ گزرا ہوا زمانہ، مگر زمانہ گزرتا کہاں ہے، گزر جاتا ہے۔ پر نہیں گزرتا۔[۶] ''بستی'' میں ذاکر کے ابا جان کے اس کردار کے حوالے سے شہنشاہ مرزا کہتے ہیں کہ ابا جان دراصل ان مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔۔ جنھوں نے بڑے ارمانوں سے پاکستان کی تعمیر کے خواب دیکھے تھے۔ مگر جو پاکستان بن جانے کے بعد وہاں کے حالات میں خود کو ڈھال نہ سکے۔ پاکستان میں ایک نئی اسلامی تہذیب کی تلاش و جستجو کا کام جاری تھا اور یہ مسلمان اپنے مشترکہ تہذیبی ورثے کو بھول نہ سکے تھے۔ اس لیے نئے ملک کی سر زمین میں وہ خود کو اجنبی ہی سمجھتے رہے۔

حال کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہونے اور نئی شناخت کو قبول نہ کرنے کے اس بحران نے کرداروں کو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا اور وہ فرار اور گریز کا رویہ اختیار کرنے لگے، گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کے

رونے اور پچھتانے لگے۔ حال کی سفاکی سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لینا ان ایک دل پسند مشغلہ بن گیا۔ نفسیات کی رو سے ماضی کی باز آفرینی کے اس عمل کو ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری نے ناسٹلجیا کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "A sad feeling mixed with pleasure when you think of happy times in the past."(۷)

انتظار حسین کے کرداروں پر ناسٹلجیا کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔ ان کے ہاں ماضی کے آثار اور نشانیاں بلیغ استعاروں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ماضی کا ہر حوالہ ایک علامت بن جاتا ہے اور یہ علامتیں بڑھ کر ایک پورے زمانے کو محیط ہو جاتی ہیں۔ استعاروں، علامتوں اور نشانیوں کے اس سمندر میں ان کے کردار غواصی کرتے ہیں اور اس کے توسط سے باطن کی زینہ پیمائی کرنے لگتے ہیں۔ سارے زمانے، روپ، اور علامات ان کے باطن میں پناہ گیر ہو کر ایک پورا جہان معنی تشکیل دے لیتے ہیں۔ مہاجرین کے وہ کردار جو اپنے حال سے جڑ نہیں پائے اور موجود کی تلخی اور کرب ناکی کو جھیل نہیں پائے ناسٹلجیا ان کے خوابوں کی جنت ہے۔ آگے سمندر ہے میں اسی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے:

> ''وہ حویلی میرے لیے اب ایک خواب تھی وہ سارا زمانہ ہی خواب و خیال ہو گیا مگر وہ کالی دیوار اس روز سے میرے پیچھے لگ گئی۔ اور دلکشا کی باقیات وہ زینہ جیسے میں اس زینہ اور اس دیوار کے بیچ آگیا ہوں۔ ان دو طلسمی طاقتوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ وقت اور برساتیں مل کر دیوار کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ سیدھی سادی دیوار، دیوار حیرت بن جاتی ہے۔ پوری عمارت ڈھے جائے اور ایک زینہ باقی رہ جائے تو پھر سیڑھیوں کے اندر سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ یہ سیڑھیاں اب میرے اندر تھیں۔ بلند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔''(۸)

بستی کے کردار بھی ناسٹلجیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ ۷۰ کی دہائی کا زمانہ ہے، سیاسی انتشار اور بے یقینی اپنے عروج پر ہے۔ پورا ملک شکست و ریخت سے گزر رہا ہے اور انجام کار ملک دو لخت ہو جاتا ہے۔ مہاجرین صدمے اور پچھتاوے سے بے حال ہو جاتے ہیں کہ کیا اسی منزل کے لیے ہجرت کا کشٹ اٹھایا تھا۔ حال سے گھبرا کر وہ ماضی میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔ ذاکر کا ذہن بھی بھٹک کر بار بار ماضی میں جا نکلتا ہے۔۔۔ باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آرہی ہیں۔ اگلے پچھلے قصے بھولی بسری باتیں، یادیں،

ایک کے ساتھ دوسری، دوسری کے ساتھ، تیسری، الجھی ہوئی جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ میری یادیں میرا جنگل ہیں، آخر یہ جنگل شروع کہاں سے ہوتا ہے۔ نہیں، میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں۔ اور وہ پھر جنگل میں تھا۔ جیسے جنگل کی انتہا تک پہنچنا چاہتا ہو۔ جیسے اپنا آپ تلاش کر رہا ہو۔[۹]

انتظار حسین کے اس رویے کو بعض ناقدین نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اسے مریضانہ رویے سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف اسے منفی رویہ قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں ماضی کے تاریک غاروں میں پناہ لینے کا عمل بے سود ہے اور اگر اسے آدرش بنا لیا جائے تو سارے امکانات معدوم ہو جائیں۔[۱۰] ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے انتظار حسین کے کرداروں کی ناسٹلجیائی کیفیت کو مثبت زاویے سے دیکھا ہے وہ اسے نفسیاتی بیماری نہیں سمجھتے بلکہ ہجرت کے ان نفسیاتی اثرات سے تعبیر کرتے ہیں جو ہجرت کرنے والوں کے ذہن و عمل پر مرتسم ہوتے ہیں۔[۱۱]

انتظار حسین کے ہاں ہجرت کے نفسیاتی مسئلے کی صورت پذیری ایک اور انداز سے بھی ہوئی ہے اور وہ ہے اضطراب اور تشویش جس کے لیے انگریزی میں Anxiety کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ نفسیات کی رو سے اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو Generalized Anxiety Disorders کہا جاتا ہے۔ ایسی کیفیت میں فرد اضطراب، اشتعال، بے کلی، تشویش اور اعصابی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے ہیں۔[۱۲]

انتظار حسین نے اپنے ناول چاند گہن میں اضطراب و اشتعال کی انھی کیفیات کو خصوصیت سے موضوع بنایا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار فیاض خان ایک باشعور، پڑھا لکھا اور نظریاتی جوان ہے۔ وہ زندگی کی توانائی اور جذبے سے معمور ہے اور اس کے دل میں ملک و قوم کے لیے تعمیری اور مثبت کردار ادا کرنے کی امنگ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس نے مسلمانوں کی آزادی اور بہتری کے لیے بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا، شہروں شہروں گھوما اور کئی روپ اختیار کیے۔ وہ ادیب اور فلسفی بنا، شاعری کی، کلکٹر ہوا، کالج کا پروفیسر بنا، تجارت کی۔ اس نے یہ سارے کردار اپنی اصلاحی تنظیم چلانے کے واسطے اختیار کیے مگر ہر محاذ پر ناکام رہا۔۔۔ غرض فیاض خان کی اردو دانی سے قفل سازی تک ہر چیز چل گئی نہ چلی تو اصلاحی تحریک نہ چلی۔[۱۳]

قیام پاکستان کے وقت وہ دلی میں مقیم تھا وہاں پر اس نے ایسے ایسے حالات دیکھے تھے کہ اس کا انسانیت پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔اب وہ لاہور آچکا تھا مگر اس کی زندگی درہم برہم ہو چکی تھی اور اس کی کوئی منزل نہ تھی۔اس نے اپنی زندگی کا بہترین وقت اور توانائیاں مسلمانان ہند کی حالت زار بہتر بنانے میں صرف کر دی تھیں مگر کامیابی حاصل نہ کر سکا تھا۔اب وہ مضطرب اور مشتعل تھا، لاحاصلی، رائیگانی اور استرداد کے کرب کے ہاتھوں وہ بے مقصدیت اور لایعنیت کا شکار ہو گیا۔اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ زندگی ضائع ہو گئی ہے اور اب وہ گہنایا ہوا چاند ہے۔اپاہج کوے کو دیکھ کر اسے لگتا ہے کہ وہ بھی اپاہج ہو چکا ہے۔ہر فضا اور ماحول میں اسے خفقان ہوتا اور کہیں سکوں نہ ملتا۔وہ پاؤں جلی بلی کی طرح مارا مارا پھرتا۔اسے لگتا کہ اس کے سینے پر بھاری پتھر لدا ہوا ہے اور دل غبار سے بھرا ہوا ہے۔کبھی وہ پر ہجوم بازاروں میں گھومتا اور کبھی ویرانوں کے چکر کاٹتا مگر جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا اسے نظر نہ آیا اور اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔۔۔۔۔۔اس کے مزاج کا پارہ چڑھ گیا اس کے لہجہ میں کچھ اور تلخی پیدا ہو گئی اور اس کی حرکات و سکنات میں ایسی تندی اور شدت پیدا ہو گئی جو عام طور پر انتہائی مایوسی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔(۱۴)

اس ساری بحث کے نتیجے میں کہا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین نے ہجرت کے نفسیاتی مسئلے کو اس کی تمام تر گھمبیرتا اور پہلوداری کے ساتھ سمجھا اور پیش کیا ہے۔فرد ہجرت کے نفسیاتی تجربے سے گزر کر باطن کی جن پہنائیوں کا سفیر ہوتا ہے اور وجود کی کرچیوں کی شیرازہ بندی میں جس طرح ناکام ہوتا ہے مصنف نے بڑی بصیرت اور دردمندی اس کا ادراک کیا ہے۔اس ضمن انتظار حسین کا نفسیاتی شعور اور مشاہدے کی پختگی قابل تحسین ہے۔انھوں نے ہجرت کے نفسیاتی کرب اور انسانی باطن کی شکست وریخت اور موجود و ناموجود کے مابین بٹی اس کی ذات کی پیچیدگی کو بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔ہجرت کے اس سارے منظر نامے کو مصنف نے اس کے سیاق و سباق اور محرکات و عوامل کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اسے کامیابی اور فن کاری کے ساتھ اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے۔

حوالہ جات:

1. Murtin EP selg man, Elaine F. walker, David L, Rosenhan, "Abnormal Psychology", New York: W.W Nath company, 4th Edition, 2001.

۲۔ انتظار حسین، بستی،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)، ص ۱۳۴: ۱۳۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۷۲: ۱۷۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۲۳: ۲۲۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔

۷۔ شہنشاہ مرزا، ''بستی: ایک کھوئے ہوئے قریے کی کہانی''، مشمولہ: تنقیدی تجزیہ، مرتبہ: شہنشاہ مرزا، (لکھنو: وکٹوریہ اسٹریٹ، ۱۹۸۳ء)، ص ۸۰۔

۸۔ https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definations/english/nostalgia

۹۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۰۷: ۲۰۶۔

۱۰۔ انتظار حسین، بستی، ص ۱۲۔

۱۱۔ ڈاکٹر اے بی اشرف، مسائل ادب تنقید و تجزیہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۷۹: ۳۷۸۔

۱۲۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول، (کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع دوم، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۰۴۔

۱۳۔ Abnormal Physiology, P, 252.

۱۴۔ انتظار حسین، چاند گہن، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۲۷: ۱۲۸۔